Part-1 

25-12-2017

عدلیہ کا امتحان

مفتی منیب الرحمٰن

پاکستان میں اعتماد و اعتبار کے حوالے سے اعلیٰ عدلیہ مختلف ادوار سے گزرتی رہی ہے، کبھی آمر کے سامنے سرنگوں ہوگئی اور اُسے مقتدرِ مطلق مان کر بن مانگے آئین کو تختۂ مشق بنانے کے اختیارات بھی تفویض کردیے اور خارجی اسباب کے سبب 2007 کی عدلیہ بحالی تحریک کے نتیجے میں طاقت ملی تو اس تحریک کے سرخیل چوہدری اعتزاز احسن کہتے ہیں: ''عدلیہ کی آزادی کی تحریک کے نتیجے میں ہمیں متکبر جج اور متشدِّد وکلا ملے''، یعنی ماحصل خسارہ ہی رہا۔ جسٹس (ر) افتخار محمد چوہدری کے ہمہ مقتدِر ہونے کے بعد اُن کا ظرف چھوٹا پڑ گیا، ہر صاحبِ منصب کی تحقیر یعنی مردم آزاری کو انہوں نے شِعار بنالیا، آج انہیں پتا چل گیا ہوگا کہ اخلاقی برتری کے بغیر منصبی اختیارات کے طفیل ملنے والی عزت عارضی ہوتی ہے۔ افسوس کہ اُن کے بعد بھی اعلیٰ عدلیہ کے بعض قابلِ احترام ججوں نے اِسی روش کو اختیار کیے رکھا، تمام مقتدر اداروں اور اشخاص کی اہانت کا سلسلہ جاری رہا، جج سیاسی مقدّمات سے لطف اندوز ہوتے رہے، ٹیلی ویژن چینلز پر اپنے فرمودات عالیہ کے مسلسل ٹِکر چلنے سے اُن کی انا کو تسکین ملتی رہی، خبرناموں اور سیاسی مباحثوں میں اُن کے تذکرے اور تصویروں کی نمائش ہوتی رہی، ایسا لگا کہ وہ مُقنِّنہ، مُقتدرہ اور سیاست سمیت تمام شعبوں کے اتالیق ہیں۔ لیکن اب وہ اعتماد و اعتبار کے بحران سے دوچار ہیں اور دہائی دے رہے ہیں کہ ہمیں لوک داستانوں کے ''بابا'' کا افسانوی مقام دیا جائے، لیکن یہ مقام بڑے ایثار، اخلاص و بے ریائی اور ریاضت کے بعد نصیب ہوتا ہے، منصب کی طاقت سے اسے پانا ایک حسین خواب ہوسکتا ہے۔

یہ مقولہ تو سنتے چلے آرہے ہیں: ''انصاف میں تاخیر انصاف سے انکار کے مترادف ہے''۔ گزشتہ دنوں عزت مآب چیف جسٹس آف پاکستان جناب جسٹس ثاقب نثار نے لاہور کی ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''انصاف میں عُجلت، انصاف کے قتل کے مترادف ہے''۔ بصد ادب گزارش ہے کہ ہمارے نظامِ عدل میں مندرجہ بالا دونوں نقائص موجود ہیں، ممتاز حسین قادری مرحوم کا کیس عاجلانہ انصاف (Justice hurried) اور آسیہ مسیح کا کیس آجلانہ انصاف (Justice delayed) کی دو نمایاں نظیریں ہیں۔ پس عالی مرتبت منصفین کے فلسفیانہ خطابات اور جارحانہ تبصرے نظامِ عدل کی شفافیت کے ضامن نہیں بن سکتے، لوگوں کو عملی تعبیر چاہیے اور یہ خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر ہے۔

ہماری رائے میں الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا پر عالی مرتبت جج صاحبان کے ریمارکس کے ٹِکر چلانے پر پابندی عائد ہونی چاہیے۔ جج صاحبان تو ''قانونِ تحفظِ ناموسِ عدالت'' کے شیشے کے گھر میں تشریف فرما ہوتے ہیں، کیونکہ اس قانون کے نفاذ کے مُدّعی اور منصف بھی وہ خود ہوتے ہیں اور ان کے فیصلے کے خلاف دادرسی کے لیے بھی کوئی عدالتی فورم بھی دستیاب نہیں ہے۔

مجھے جب بھی فرصت ملتی ہے، مغربی ممالک کا الیکٹرانک میڈیا دیکھ لیتا ہوں، وہاں یہ مناظر نظر نہیں آتے، عدالتیں اپنے دائرۂ کار میں خاموشی سے کام کر رہی ہوتی ہیں، جج نہیں بولتے، ان کے فیصلے بولتے ہیں۔ ہمارے ہاں اب عالی مرتبت جج صاحبان زیادہ بولنے لگے ہیں، اس سے نمود کی ایک نفسیات جنم لے رہی ہے جو معیاری اور مثالی عدل کے لیے تباہ کن ہے، پس بہتر ہے کہ یہ لائق و فائق مقدس شخصیات سیاہ جبہ اتار کر سیاست کے میدان میں آ کر قوم کی رہنمائی فرمائیں۔ جناب اعتزاز احسن کے ریمارکس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالی مرتبت جج صاحبان کی مقدس زبانوں سے توہین آمیز ریمارکس سے فاضل وکلاء کے جذبات بھی مجروح ہو رہے ہیں، لیکن حدِ ادب مانع ہے، فریاد کے لیے کوئی دیوارِ گریہ بھی نہیں ہے۔ دوسری جانب وکلاء صاحبان بھی اپنے آپ کو تمام تر قانونی و اخلاقی حدود سے ماورا سمجھنے لگے ہیں، اس جارحانہ انداز کا نتیجہ یہ ہے کہ وضع داری و شرافت پر مبنی اقدار کے حامل ہمارے سینیئر وکلاء آج اس باوقار پیشے سے وابستگی کو اپنے لیے باعث شرم محسوس کر رہے ہیں، الغرض بنچ اور بار دونوں کو خود احتسابی کی ضرورت ہے۔

ممتاز قادری شہید کے کیس میں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس (ر) خواجہ محمد شریف اور جسٹس (ر) نذیر اختر ان کے وکیل تھے، ہمارے ایک فاضل علامہ سید حبیب الحق شاہ، جو انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے شریعہ اور لا میں پوسٹ گریجویٹ ہیں، اُن کے معاون تھے۔ انہوں نے بتایا کہ سپریم کورٹ میں سماعت اور بعد میں ریویو پٹیشن میں بھی عدالت عُجلت میں تھی اور ہمیں مناسب وقت دینے کے لیے تیار نہ تھی، ہمارے اصرار پر کہا گیا کہ آپ اپنے دلائل لکھ کر دے دیں۔ میں نے ان سے پوچھا: کیا فیصلے میں آپ کے دلائل کا حوالہ دے کر انہیں کسی دلیل سے رد کیا گیا ہے، انہوں نے کہا: ہمارے دلائل کا حوالہ فیصلے میں نہیں ہے۔ عالی مرتبت جناب جسٹس آصف سعید خان کھوسہ ہی اس بنچ کے بھی سربراہ تھے جو بعض مقدمات کو انتہائی عُجلت میں انجام تک پہنچانا چاہتے ہیں، لیکن اسی عدالت کی الماریوں میں شاتمۂ رسول آسیہ مسیح کی پٹیشن کی فائل عرصے سے دبی ہوئی ہے اور اس کے لیے کسی کو عُجلت نہیں ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ کسی دن ہم سنیں کہ کسی بیماری کے سبب وہ ضمانت پر رہا ہو گئی، پھر یورپ کے کسی سفارت خانے کی مدد سے وہ یورپ جا پہنچی اور اسے وہاں شہریت اور دیگر اعزازات سے نواز دیا گیا، گزشتہ دنوں بعض اخبارات میں رپورٹ ہوا کہ اُسے یورپین یونین کی جانب سے ''آندرے سخاروف ایوارڈ'' سے نوازا جا چکا ہے۔ اس کا کیس اسی لیے دبایا ہوا ہے کہ اگر اس کی سماعت شروع ہو جائے، تو آزاد میڈیا، لبرل دانشور، غیر ملکی وسائل سے فیض یاب این جی اوز، مغربی حکومتیں اور مختلف ادارے آسمان سر پر اٹھا لیں گے۔ اس کا دباؤ نہ ہماری حکومت برداشت کر سکتی ہے، نہ ہی ہماری لائق صد افتخار عدلیہ یہ ہمالیہ سر کر سکتی ہے، اسی روش کو چنیدہ انصاف کہتے ہیں۔

حال ہی میں ایک قومی روزنامے میں ایک تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی ہے کہ پیمرا نے الیکٹرانک میڈیا کے مختلف چینلز کو جو نوٹسز جاری کیے، اعلیٰ عدلیہ نے ان پر اٹھارہ سو امتناعی احکام جاری کر رکھے ہیں، ان کی شنوائی اور فیصلے کی نوبت نہیں آرہی، کیونکہ میڈیا طاقتور ہے، ہماری عالی مرتبت عدالتوں کو اس طرح کے احکام امتناعی کے اجرا پر عالمی ایوارڈ ملنا چاہیے۔ لاہور میں تقریباً دو کھرب روپے کا اورنج ٹرین کا منصوبہ بھی اس کی روشن مثال ہے۔ چوبرجی کی تقدیس کی حفاظت کے لیے یہ منصوبہ، جس پر شاید اسّی فیصد سرمایہ خرچ ہو چکا تھا، کافی عرصہ تعطّل کا شکار رہا، اِس کا بوجھ قوم نے اٹھانا ہے۔ کسی پر دو سال میں فرد جرم عائد

نہیں ہو پا رہی اور کسی کے مقدمے پر سائنک رفتار سے چلانے کے احکامات صادر ہوتے ہیں، سپریم کورٹ کے عالی مرتبت جج اس کی نگرانی کا فریضہ انجام دیتے ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ عزت مآب چیف جسٹس آف پاکستان کے فرمودات مبارکہ کا اشارہ کس طرف ہے۔

امریکہ میں بعض ممالک کے خلاف سفری پابندیوں پر عائد صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے احکامات پر ریاستی عدالتوں نے احکام امتناعی جاری کیے، تو وہاں کی سپریم کورٹ نے درمیانی راستہ نکالا اور بعد میں حتمی فیصلہ صادر کر دیا۔ کراچی میں پی سی ہوٹل کے بالمقابل ستر کے عشرے سے ایک کئی منزلہ عمارت کا ڈھانچہ کھڑا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا، کیا یہ سرمائے کا ضیاع نہیں ہے، یہ کراچی کی پرائم کمرشل لوکیشن ہے۔ قابلِ احترام اعلیٰ عدلیہ سے گزارش ہے کہ طویل عرصے سے معلق معاملات کے حل کے لیے کوئی درمیانی راستہ نکال کر معاملات کو نمٹائیں، کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تو وہاں کوئی ریاستی یا رفاہی ادارہ قائم کرنے کا حکم ہی صادر فرمادیں۔

الغرض ہمارا نظام انصاف دونوں اقوال کا امتزاج ہے، آئے دن ہم اخبارات میں ''ازالہ حیثیت عرفی'' کے مقدمات کے بارے میں پڑھتے رہتے ہیں، جن کی شنوائی یا فیصلے کی نوبت نہیں آتی، ایسے قانونی نوٹس یا مقدمات مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوشل اور الیکٹرانک میڈیا کے اندر شیشے کے گھروں میں بیٹھے ہوئے منہ زور لوگ اور عوامی جلسوں میں قابلِ احترام سیاسی رہنما دوسروں کی تذلیل کو اپنا شِعار بنائے ہوئے ہیں اور ہمارا نظام قانون وعدل لوگوں کی عزتوں کی حفاظت میں ناکام ہے۔ عدل میں تاخیر کا عالم یہ ہے کہ گزشتہ دنوں قتلِ عمد کے الزام میں 19 سال قید کاٹنے کے بعد جب مظہر حسین خواجہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر طبعی موت مر گیا تو اس کے دو سال بعد سپریم کورٹ آف پاکستان نے اسے بے قصور قرار دے کر بری کر دیا، سوال یہ ہے کہ اس کی 19 سالہ بے جواز قید کا حساب کون دے گا، عدالت پر لازم تھا کہ وہ حکومت کو حکم جاری کرتی کہ اُس کے ورثا کو مناسب مالی معاوضہ دے، لیکن ایسا بھی نہیں ہوا، ''Justice delayed'' اور کسے کہا جاتا ہے۔

ہمارے سامنے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ مبارک کی ایک مثال ہے: ''ایک شخص طواف کے دوران زائرین کے قدموں تلے کچلے جانے سے فوت ہو گیا، اس کے ورثاء نے حضرت عمر فاروق کی عدالت میں انصاف طلبی کے لیے رجوع کیا، انہوں نے پوچھا: تمہارے پاس کوئی ثبوت یا شہادت ہے کہ اس کے گرنے یا روندے جانے کا سبب کون بنا؟۔ انہوں نے کہا: نہیں، آپ نے فرمایا: ثبوت کے بغیر میں کسی کو کیسے قصوروار قرار دے سکتا ہوں۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امیر المومنین! مومن کا خون رائیگاں نہیں جاتا، آپ اِس کی دیت کو بیت المال سے ادا کریں۔ حضرت عمر فاروق نے حضرت علی کے اس فیصلے کو دل وجان سے تسلیم کیا، بیت المال سے دیت ادا کی اور کہا: ''اگر علی نہ ہوتے، تو عمر ہلاک ہو جاتا''۔

مغرب میں عدالتوں کی کوشش ہوتی ہے کہ مقدمے کے فریقین اپنے معاملات عدالت سے باہر طے کر لیں اور اس کے لیے وہ مناسب موقع دیتے ہیں، ایک مصالحتی وکیل بھی مقرر کرتے ہیں، لیکن جب ایک مرتبہ مقدمے کی شنوائی شروع ہو جائے، تو فیصلہ ہو کر رہتا ہے اور متاثرہ شخص کو جارح فریق سے مقدمے کے اخراجات سمیت مناسب ریلیف بھی دیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہاں ناگزیر صورت حال کے بغیر لوگ عدالتوں کا رخ نہیں کرتے۔

(روزنامہ دنیا، 25، دسمبر 2017ء)